اخبار و آثار

سید مطیع الرحمٰن

مدرسہ ڈسکورسز کا سمر انٹنسو

مدرسہ ڈسکورسز کا سمر انٹنسو (جولائی 2018ء) نیپال میں منعقد کیا گیا۔ یہ انٹنسو بھی گزشتہ وِنٹر انٹنسو (قطر) کی طرح علمی و فکری سرگرمیوں سے بھرپور رہا۔ یکم جولائی تا 15 جولائی جاری رہنے والے اس پروگرام کے انعقاد کے لئے نیپال کا ایک نہایت پر فضا مقام دُلے خیل منتخب کیا گیا جو کھٹمنڈو سے تقریبا 30 کلومیٹر شمال کی جانب واقع ہے۔ یہ نہایت حسین اور دلکش علاقہ ہے جہاں جولائی کے مہینے میں بھی گرمی کا احساس نہ ہوا۔

یہ ورکشاپ کئی لحاظ سے نہایت قیمتی تھی۔ ایک پہلو اس کا علمی و فکری تھا جو سیمینار ہال کے اندر کی مختلف سرگرمیوں پر مشتمل تھا، جس میں اساتذہ کے لیکچرز، سوال و جواب کی نشستیں اور ڈسکشن گروپس وغیرہ شامل تھے۔ دوسرا یہ کہ اس گروپ میں کچھ امریکی اور ساؤتھ افریقی طلبہ و طالبات اور اسکالر بھی شامل تھے، جن سے مختلف حوالوں سے گفت و شنید کے مواقع بھی میسر آتے رہے اور ان سے ان کے مذہب، تہذیب، سماج اور دیگر مختلف پہلوؤں سے گفتگو ہوتی رہی۔ تیسرا پہلو جو اسی قدر اہمیت کا حامل تھا، وہ ہوٹل سے باہر نیپالی سماج، ان کے مذاہب، ان کے رہن سہن اور ان کے طور اطوار اور روزمرہ زندگی کے مشاہدے سے متعلق تھا۔ چوتھا یہ کہ ہر روز بعد از مغرب تخلیق و ارتقائے کائنات سے متعلق نہایت اہم ڈاکیومینٹری فلم Cosmos دکھائی جاتی تھی۔ 45 منٹ کے دورانیے پر مشتمل اس فلم میں کائنات کے آغاز، حیاتِ انسانی کے ارتقا اور دیگر پہلوؤں سے متعلق جدید سائنسی نظریات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ تخیلاتی طور پر ایک شخص ٹائم مشین کے ذریعے کائنات کی تخلیق کے مختلف مراحل میں کسی بھی دَور میں چلا جاتا ہے اور اس دور کی خصوصیات کو نمایاں کرتا ہے۔ پانچواں اور نہایت قیمتی پہلو جو ذاتی طور پر میرے لئے بڑا خاص تھا، وہ یہ کہ چند دوستوں نے ڈاکٹر ابراہیم موسی اور ڈاکٹر ماہان مرزا سے ان کی ذاتی زندگی کے مختلف احوال و آثار اور ان کے علمی و فکری ارتقاء کے حوالے سے انٹرویوز کا پروگرام بنایا، جس میں خوش قسمتی سے میں بھی شامل تھا۔ (ان انٹرویوز کو ہمارے دوست مولانا وقار احمد صاحب تحریری

شکل میں منتقل کر رہے ہیں۔)

سیمینار ہال کے اندر کی علمی و فکری سرگرمیوں کا محور جن اہم موضوعات و مباحث کو بنایا گیا اور ان پر گفتگو کرنے کے لئے اعلیٰ ترین اساتذہ کو مدعو کیا گیا، انہیں چار بنیادی موضوعات میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں پہلا موضوع "اسلامی قانون اور جنس (ماضی کے نظائر اور معاصر تحدیات)" تھا۔ اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کے لئے ولیم کالج امریکہ کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سعدیہ یعقوب کو مدعو کیا گیا۔ پہلے تین دن اسی موضوع کے لیے مختص تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے جنس اور قانون کے حوالے سے قدیم انسانی تاریخ، اسلامی فقہی تراث اور اسلامی قانون کو، جو زیادہ تر قدیم فقہی ذخیرے پر مشتمل ہے، درپیش معاصر تحدیات نیز مختلف نسائی تحریکوں (Feminist Movements) کی طرف سے مختلف اعتراضات کا جائزہ پیش کیا اور خصوصا مسلم خواتین سکالرز، کیشا علی آمنہ ودود اور حنا اعظم کی طرف سے اس کے مختلف جوابات (Responses) کا علمی و فکری تجزیہ پیش کیا۔ عصمت دری کے حوالے سے قانون سازی بطور خاص زیر بحث آئی اور مرحلہ وار قدیم مشرقی تہذیبوں، موسوی اور ربّانی قوانین، رومی اور مسیحی قانون سازی، قبل از اسلام عرب رسوم و رواج، اور پھر اسلام کی آمد کے بعد فقہِ اسلامی میں اس جرم سے متعلق قانون سازی اور اس کی بنیادوں پر نہایت سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ فقہ اسلامی کے حوالے سے خاص طور پر جو بات زیرِ بحث آئی، وہ یہ کہ فقہائے کرام نے جس دور میں قانون سازی کی اور فقہ اسلامی کی تشکیل ہوئی، اس وقت ان کے ہاں پہلے سے موجود بہت سے مفروضات (Assumptions) تھے جو ان اصول و قوانین کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر رہے تھے۔ آج ہمیں اگر ان قوانین میں نامانوسیت اور اجنبیت محسوس ہوتی ہے اور دور جدید کے ساتھ عدم مطابقت دکھائی دیتی ہے تو اس کی وجہ اس دور کا سماجی پسِ منظر ہے جسے ہم مسلسل نظر انداز کرتے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر موصوفہ نے فرمایا کہ یہاں ہمیں ڈاکٹر فضل الرحمان کی (Double Movement) والا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ یعنی پہلے ہم فقہا کے سماجی اور معاشرتی پسِ منظر میں جھانکیں گے، اور ان کے دور میں جا کر ان کی صنفی تفریق کی بنیاد پر کی گئی قانون سازی کی تفہیم حاصل کریں گے کہ انہوں نے اپنے دور کے حالات اور ماحول کو کس قدر اہمیت دیتے ہوئے اپنی سماجی فضا سے مطابقت رکھنے والے قوانین کی تشکیل کی۔ پھر ہم انہی اصولوں کی بنیاد پر دوبارہ واپس اپنے دور میں آئیں گے اور آج کے سماجی و معاشرتی طور و اطوار اور حالات و واقعات کے تناظر میں جدید سماجی ڈھانچے سے موافقت رکھنے والے قوانین کو مدون و مرتب کریں گے۔

حنفی فقہ کی مشہور کتاب المبسوط کے ایک اقتباس پر بھی بحث کی گئی اور جنسی جرائم کے حوالے سے مختلف اصطلاحات اور قوانین کا جائزہ لیا گیا۔ تفصیلی مباحث سے قطع نظر، ایک بات بڑی غیر معمولی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ نے وہی فقہی قوانین جو ہم نے کئی بار پڑھے اور سنے تھے، اس قدر گہرے تجزیاتی انداز میں پیش کیے کہ شرکاء داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے تو دل میں تہیہ کر لیا کہ جو متون ہم نے نہایت سرسری انداز میں نظر سے گزار دیے تھے، انہیں اسی قدر گہرے خوض اور عمیق نظر سے دیکھوں گا۔ میرے خیال میں اس طرح کے مطالعے کے بغیر نہ تو ہم اپنی فقہی تراث کی حقیقی تفہیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی نئی تحدیات سے نبرد آزما ہونے کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔

انٹنسو کا دوسرا اہم موضوع "اخلاقی تصورات کے نئے آفاق کے ذریعے اخلاقی تبدیلیوں کی نظریہ سازی" تھا۔ اس موضوع پر تین اساتذہ نے گفتگو فرمائی جن میں پروفیسر جیرالڈ میکینی (Gerald Mackany)، پروفیسر محمود یونس اور اس پروگرام کے روح رواں ڈاکٹر ابراہیم موسی شامل تھے۔ پروفیسر جیرالڈ میکینی نے فطرتِ انسانی اور بائیو ٹیکنالوجی کے موضوع پر نہایت اعلیٰ گفتگو فرمائی اور جدید بائیو ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانی فطرت میں جوہری تبدیلیوں کے حوالے سے حالیہ پیش رفت اور مستقبل کے عزائم کے تناظر میں، مسیحی مذہبی فکر کے چار نمائندہ مکاتب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جو ایک طرف جدید حیاتیاتی سائنس کی تحدیات کے لئے مذہبی جواب تھا تو دوسری طرف ہمارے لئے غور وفکر کا سامان پیش کرتا تھا کہ مسیحیت کو ہم سے قدرے پہلے ان مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے اور ان کی مذہبی روایت نے اس پر کیا ردعمل ظاہر کیا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

پروفیسر محمود یونس نے، جو پی ایچ ڈی اسکالر ہیں اور ڈاکٹر ابراہیم موسی کی زیرِ نگرانی مقالہ لکھ رہے ہیں، فطرتِ انسانی کی فلسفیانہ تفہیم کے لیے ورکشاپ کے شرکاء کے سامنے آٹھ مختلف سوالات رکھے۔ خاص طور پر مذکورہ موضوع پر ملا صدرا شیرازی کے فلسفے پر روشنی ڈالی۔ عالم خارج میں اشیاء کی نیچر اور نفسِ انسانی کی فطرت کا مطالعہ ملا صدرا کی توضیحات کی روشنی میں پیش کیا۔ یوں فطرتِ انسانی اور ماہیتِ اشیاء کے حوالے سے ہماری تعقلی اور فلسفیانہ روایت کی ایک مختصر جھلک بھی ہمارے سامنے آ گئی۔

ڈاکٹر ابراہیم موسی کی گفتگو کا محور امام عبد الوہاب الشعرانی کی کتاب "ارشاد الطالبین" کے بعض صوفیانہ اور حکیمانہ مباحث تھے جن کی روشنی میں آپ نے دین کی تفہیم کے لیے لامحدود امکانات کو واضح فرمایا۔ شعرانی، ابن عربی جیسے فقید المثال صوفی کے شاگرد ہونے کے ناتے سے چیزوں کو محدود قانونی

وفقہی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے ہاں بقول ڈاکٹر صاحب، ایک Poetic Sensibility موجود ہے، جس سے تدبر و تفکر کے امکانات (Contingencies) لامحدود ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ:

We need to develop aesthetic sensibility.

ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح کائنات کی ہر شے میں جمال موجود ہے، اسی طرح قرآن و سنت اور ہماری دینی روایت میں بھی یہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ جمالیاتی شعور واحساس کے بغیر کیسے ممکن ہے کہ ہم قرآن وسنت کو کماحقہ سمجھ سکیں اور اس کی وسعتوں اور ان میں موجود امکانات سے بھرپور انداز میں فائدہ اٹھا سکیں۔ مثلاً الواح پر بات کرتے ہوئے شعرانی لکھتے ہیں کہ احکام کا تعلق الواح المحو والاثبات سے ہے اور ان الواح پر لکھا ہوا مٹتا اور تبدیل ہوتا رہتا ہے اس لئے احکام قابلِ تغیر ہیں۔ یوں شعرانی کی یہ بات ہمارے لئے احکام کے میدان میں نئے فکری آفاق کھول دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تمثیلی بیانیہ میں گہرائی اور گیرائی زیادہ ہوتی ہے، اور یہی اپروچ ہمیں شعرانی کے ہاں ملتی ہے۔ مزید یہ کہ اس طرح کی اپروچ ہماری روایت میں اجنبی نہیں ہے۔ مثلاً ناموس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل قرار دیا لیکن بعد میں اسے خیر کے حوالے سے بھی دیکھا گیا۔ اسی طرح شعرانی جبریل کے پروں کو ایک اور تناظر میں دیکھتے ہیں آخر میں استادِ معظم نے اپنی بات کو یوں سمیٹا کہ ہم جہاں فقہ، تاریخ، تفسیر و حدیث کی پوری روایت کا مطالعہ کرتے ہیں، وہاں ہماری روایت کا ایک صفحہ یہ بھی ہے جو میں نے آپ کے سامنے شعرانی کی صورت میں پیش کیا۔ آپ چاہیں تو اسے پھینک دیں، لیکن اس تناظر میں مضمر نئے ممکنات Contingences بہر حال ہمارے لئے نئی فکری دنیائیں پیدا کر سکتی ہیں۔

تیسرا بڑا موضوع "عالمگیر دنیا میں جنس، مذہب اور قیامِ امن" تھا جس کے لئے پروفیسر اطالیہ عمیر (Atalia Umair) اور پروفیسر جیسن اسپرنگ (Jason Spring) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس اہم موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر اطالیہ عمیر نے یہودی مذہبی لٹریچر میں عورتوں کے حوالے سے قوانین کی از سرِ نو تشکیل کی ضرورت کو واضح کیا اور یہودی مذہبی قوانین پر ترقی پسند مفکرین خصوصاً ترقی پسند خواتین کے اعتراضات اور یہودی قانون میں اس کے لئے مزید گنجائشوں پر غور کرنے کے امکانات کا جائزہ پیش کیا۔ جنس اور مذہبی قوانین کے حوالے سے وہ مسائل جو ڈاکٹر سعدیہ یعقوب نے اسلام کے حوالے سے پیش کیے، کم و بیش اسی طرح کے مسائل یہودیت کے فقہی اور قانونی ڈھانچے میں بھی پائے

جاتے ہیں۔

دوسری اہم بات جو اس سیشن میں نمایاں طور پر سامنے آئی، وہ عالمی قیامِ امن کے حوالے سے تھی، جس کے لئے کرنے کا بنیادی کام تمام مذاہب کے درمیان مفاہمت اور مثبت مکالمے کی فضا قائم کرنا ہے۔ مذہبی کشمکش اور منافرت کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم صرف اپنے مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں جبکہ اس موضوع پر کسی دوسرے مذہب کا موقف نہ تو سننے کے لیے تیار ہیں اور نہ اس پر آزادی سے غور و فکر کے عادی ہیں۔ اس سلسلے میں چند وڈیوز بھی دکھائی گئیں جن میں مختلف مذاہب کے اسکالرز اور اہل علم آپس میں نہایت مثبت انداز میں اپنے اپنے مذہبی متون کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں تمام مذاہب کے نمائندوں کو دوسرے مذاہب کا موقف خود ان کی زبانی سننے کا موقع میسر آتا ہے۔ اس مکالماتی فضا کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے انہوں نے پانچ بنیادی اصول بھی بیان کیے جو یہ ہیں:

1. We should develop the mutual understanding.
2. Try to release tension among the people.
3. Give awareness of common goods and facilitate them.
4. We can use the Methodology of Conflict Resolution Mechanisms.
5. By adopting moral values.

چوتھا اور آخری موضوع "جنوبی ایشیا کی حالیہ مذہبی فکر میں کلامی تجدید کے راستے" تھا۔ یہ موضوع استادِ محترم مولانا عمار ناصر صاحب اور محترم ڈاکٹر وارث مظہری کے حصے میں آیا۔ ڈاکٹر وارث اپنی بعض تدریسی مصروفیات کی وجہ سے ورکشاپ میں آخر تک شامل نہ رہ سکے۔ لہٰذا اس موضوع پر دو دن استاد محترم عمار صاحب ہی نے گفتگو فرمائی۔

اپنی گفتگو کے پہلے حصے میں استادِ گرامی قدر نے ورکشاپ کے پہلے دس دن کی پوری علمی و فکری روداد کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا اور پھر اس موضوع کو اس کے ساتھ جوڑتے ہوئے جنوبی ایشیا اور خاص طور پر بر صغیر پاک و ہند میں پچھلے دو اڑھائی سو سال کی تجدیدی مساعی اور بیدار مغز مسلم علما و مفکرین اور اہل دانش کے چند کلامی و فکری تجدیدی کارناموں کو بحث کا موضوع بنا کر اس بات پر روشنی ڈالی کہ بر صغیر کی مذہبی روایت میں جو تبدیلیاں آئیں اور بڑے بڑے فکری سوالات سامنے آئے، ان کو

اہل علم نے کیسے حل کیا۔ مثلا جب ہم اس خطے یعنی بر صغیر میں سیاسی طور پر غالب تھے تو صورتحال اور تھی ،جب حکومت ختم ہو گئی تو اب نئے تصوراتِ سیاست سامنے آئے۔ اب سوال یہ تھا کہ انہیں کیسے دیکھا جائے۔ ایک بڑا مسئلہ "جہاد" تھا جو کئی حوالوں سے موضوع بن گیا۔ مثلا یہ اعتراض ہوا کہ اسلام زبردستی پر یقین رکھتا ہے، تلوار کے ذریعے پھیلا ہے، محمد ﷺ (معاذاللہ) ایک تشدد پسند مذہبی رہنما تھے، وغیرہ۔ اس کے جواب میں اسلام کے تصور جہاد کو واضح کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ نوآبادیاتی دور میں جہاد کی نوعیت پر بحث ہوئی کہ آیا اسلام میں جہاد اقدامی ہے یا دفاعی۔ پھر جب بیسویں صدی کے وسط میں مسلمان قومی ریاستیں قائم ہونا شروع ہوئیں تو اسی مسئلے کی نئی جہت سامنے آئی کہ ان مسلم ریاستوں کے غیر مسلم قوموں کے ساتھ تعلق کی نوعیت خصوصا جہاد کے تناظر میں کیا ہوگی۔ اسی طرح جب نوآبادیاتی حکومت ختم ہوئی تو بر صغیر میں ایک اور بحث پیدا ہوئی کہ چونکہ اب مسلمان دوبارہ ماضی کی مسلم سلطنت بحال نہیں کر سکتے تو اب مستقبل کے لیے ان کا لائحہ عمل کیا ہو۔ مذہبی فکر کے سامنے یہ ایک بڑا سوال یہ تھا جس کے جواب میں علماء دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔ ایک طبقے نے قومیت کے جدید تصور کو اپناتے ہوئے کہا کہ ہمیں متحدہ ہندوستان میں رہنا چاہیے جبکہ ایک طبقے کے نزدیک متحدہ قومیت کا تصور اسلامی اصولوں کے سراسر خلاف ٹھہرا۔ اسی طرح دیگر متعدد مسائل پر شاہ ولی اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، سید انور شاہ کاشمیری، عبید اللہ سندھی، مناظر احسن گیلانی، وحید الدین خان، علامہ شبلی، سر سید احمد خان اور جاوید احمد غامدی کی منتخب تحریرات کی روشنی میں بر صغیر کی علمی و فکری روایت کو درپیش نئے چیلنجز اور ان کے ریسپانسز کا تجزیہ پیش کیا گیا۔

ورکشاپ میں چائے کے وقفوں، کھانے کے دوران میں، اور دیگر کئی مواقع پر اساتذہ، نوٹرے ڈیم یونیورسٹی کے طلبہ اور ساؤتھ افریقی مہمانوں کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کا موقع ملا۔ ایک سوال جو مجھ سے ذاتی طور پر ساؤتھ افریقی مسلم سکالرز اور طلبہ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا، وہ یہ تھا کہ آپ انگریزی لباس میں کلین شیو چہرے کے ساتھ پاکستان میں کیسے ایک اسلامی شعبے میں ایڈجسٹ ہو گئے ہیں۔ کیا آپ کو شدید تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟ ان کے بقول ساؤتھ افریقہ کے ایک علاقے میں تو اسے گوارا کر لیا جاتا ہے لیکن اسی ملک کے دوسرے علاقے میں جہاں زیادہ تر انڈین کمیونٹی کے علماء ہیں، یہ بالکل بھی قابلِ قبول نہیں۔ میں نے بہرحال جواب کے مثبت پہلو کو ہی نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی۔

پروفیسر پروفیسر جیرالڈ مکینی (Gerald Mackeny) پاکستان کے نامور مسلم مفکر ڈاکٹر فضل

الرحمان کے براہ راست شاگرد رہے ہیں، لہٰذا ان سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے حوالے سے کافی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ ایک دن جب میں پروفیسر موصوف کے ساتھ کھانے کے دوران میں گفتگو کر رہا تھا تو نوٹرے ڈیم کی ایک طالبہ بھی آ گئی اور ہمارے ساتھ شریکِ گفتگو ہو گئی۔ بات چلتے چلتے واک (Walk) کرنے کی افادیت پر پہنچی تو پروفیسر مکینی مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ واک کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ پہلے کرتا تھا، آج کل چھوڑی ہوئی ہے تو انہوں نے کہا کہ You should walk . میں نے کہا، ان شاء اللہ تو اس پر ساتھ بیٹھی امریکی طالبہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور کہا "ان شاء اللہ"۔ میں نے سمجھا کہ شاید اسے ان شاء اللہ کے معنی معلوم نہیں۔ پوچھا تو کہنے لگی کہ جانتی ہوں کہ اگر اللہ نے چاہا۔ خیر بات آگے بڑھ گئی، مگر میں اس قہقہے کے بارے میں سوچتا رہا جو مجھے کہہ رہا تھا کہ ایک کام جو آپ جب چاہیں کر سکتے ہیں، اس کے بارے میں بھی یہ کہنا کہ اگر اللہ چاہے تو، یعنی اس کام میں اللہ کی مرضی کا کیا مطلب؟ طالبہ کے اس قہقہے میں اس کا پورا Worldview جھلک رہا تھا۔

ورکشاپ کا ایک غیر معمولی پہلو نیپالی سماج اور ان کے معاشرتی ماحول کا مشاہدہ تھا۔ ہر روز عصر کے بعد اتنا وقت میسر آ جاتا کہ قریبی علاقوں، یہاں تک کہ گلی محلوں میں لوگوں سے ملاقات کا بھرپور موقع ملا۔ چند باتیں اس مشاہدے کی بھی ملاحظہ کیجئے۔

نیپال کے ہندوانہ معاشرے میں صوفیانہ مساعی اور ان کے اندازِ تبلیغ کی اہمیت وافادیت کا پوری طرح سے ادراک ہوا کہ اس طرح کے کثیر المذاہب معاشروں میں اس سے بہتر کوئی اور طریقہ یا اسلوبِ دعوت نہیں ہو سکتا تھا۔ صوفیا کے ہاں اس قدر وسعتِ قلبی اور دیگر اہل مذاہب کے ساتھ غیر معمولی رواداری کی حکمت پوری طرح سمجھ میں آئی اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس طرح کے معاشروں میں صوفیانہ مزاج، طرزِ تکلم اور عظیم اخلاق ہی سے خدمتِ اسلام کی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر معاصر دنیا میں اس کی افادیت اور بھی بڑھ چکی ہے۔

نیپالی معاشرے میں عورتوں کے لباس کے حوالے سے بڑا تعجب ہوا کہ بظاہر یہ بھی ایک مذہبی معاشرہ ہے اور جگہ جگہ مذہبی شعائر اس بات کی علامت ہیں کہ یہاں کے لوگ مذہب سے کس قدر متعلق ہیں، لیکن یہاں عورتوں کا لباس وہی مغربی طرز کا ہے، یعنی جسم کے خدوخال کو پوری طرح نمایاں کرنے والا۔ ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ نیپال ہمارے ہی خطے کا ملک ہے، صدیوں سے مذہبی معاشرت رکھتا ہے، آخر کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس معاشرے نے یہ تبدیلی فوراً قبول کر لی؟ ایک جواب ذہن میں یہ آیا

کہ شاید یہاں کے مذہبی رہنما اور نمائندے سوسائٹی میں اپنا اثر و رسوخ کھو چکے ہیں اور اس تبدیلی کے آگے بند باندھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ لیکن پھر مزید غور کرنے سے یہ بات عیاں ہوئی کہ ہندو مذہب کی Mythology میں ہی جسم کی عریانی موجود ہے اور جسم کے اعضا کی نمائش ان کی دیویوں کے مجسموں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ شاید مذہب کی فراہم کردہ یہی بنیاد ہے جس نے اس معاشرے کو مغربی طرز کا نیم عریاں لباس اپنانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آنے دی۔

نیپال میں ہندو مت اور بدھ مذہب کی عبادت گاہوں میں بھی جانے کا موقع ملا۔ بدھ ناتھ، بدھ مت کی ایک بڑی عبادت گاہ ہے اور لوگ اس کے گرد اسی خشوع خضوع سے طواف کر رہے تھے جیسے بیت اللہ میں مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس میں خاص چیز ان کی عبادت کا طریقہ تھا جو کافی حد تک ہماری نماز سے ملتا جلتا تھا۔ ہمارے ہاں اب کئی لوگ عبادت کے صرف ظاہری پہلو کو لے کر، اس کی جسمانی افادیت پر زور دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام فطری مذہب ہے اور سائنس بھی بتاتی ہے کہ اس طرح سے سجدہ اور رکوع کرنے سے جسم کے فلاں فلاں اعضا تن درست رہتے ہیں اور فلاں فلاں بیماری سے حفاظت بھی ہوتی ہے۔ اگر عبادت، عبد و معبود کے تعلق سے ہٹا کر، ان ظاہری حرکات و سکنات کے افادی پہلوؤں کو ہی معیار بنانے کا نام ہے تو معذرت کے ساتھ، مجھے بدھ مت کی عبادت میں افادیت کا یہ پہلو ہماری نماز سے کہیں زیادہ نظر آیا۔ ان کی عبادت کی بنائی ہوئی وڈیو جس کسی کو بھی دکھائی، اس کا پہلا تبصرہ یہی تھا کہ یہ اچھی ورزش ہے۔

نیپال میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور بدھوں سے کافی کم ہے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہاں کے جتنے بھی مسلمان ہیں، ان کی اکثریت ہندوستانیوں کی ہے۔ نیپال کے اصل باشندے بہت کم مسلمان ہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر تحقیق کی جا سکتی ہے کہ مقامی آبادی کے اسلام کی طرف بہت کم مائل ہونے میں کون کون سے عوامل کارفرما رہے ہیں۔ یقینا اس میں مختلف سماجی، تہذیبی، علاقائی، سیاسی، ثقافتی، جغرافیائی اور معاشی اسباب و علل کارفرما رہے ہوں گے جو تحقیق طلب ہیں۔ اس سے بھی دلچسپ سوال یہ ہے کہ مہاتما گوتم بدھ کی جائے پیدائش ہونے کے باوجود یہاں خود بدھوں کی تعداد بھی بارہ پندرہ فیصد سے زیادہ کیوں نہیں۔

نیپالی عوام کو خاص پر ٹریفک کے اصولوں کا پابند پایا اور اپنے پندرہ روزہ قیام کے دوران میں کسی بھی موٹر سائیکل سوار کو ہیلمٹ کے بغیر نہیں دیکھا۔ ایک دن کرنسی ایکسچینج کے سلسلے میں بنک جانا ہوا تو وہاں

گارڈ کے بیلٹ کے ساتھ لیدر کے کور میں پستول کی جگہ خنجر دیکھ کر کئی سوال اپنے جواب کے ساتھ ذہن میں در آئے۔

آخری دن جہاں دیگر پاکستانی اور ہندوستانی طلبا نے مدرسہ ڈسکورسز سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا، وہاں مجھے بھی چند جملے کہنے کا موقع میسر آیا۔ میں نے مختصرا یہ کہا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک جگہ مدارس کے طلبا اور ان کے نظامِ تعلیم کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہمارے طلبا کی مثال اصحاب کہف کی سی ہے کہ وہ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں اور جب آٹھ دس سال کے بعد مدرسہ سے تحصیلِ علم کے بعد نکلتے ہیں تو باہر کی دنیا بالکل بدل چکی ہوتی ہے۔ سکہ رائج الوقت تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ زمانے کا اسلوب ذرا بھی ان کے اسلوب سے میل نہیں کھاتا۔ اپنے دور کے مسائل سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس مثال کو ذرا وسیع تناظر میں دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں بحیثیت امت ہمارا حال مدرسے کے طالب علم سے زیادہ مختلف نہیں۔ زرعی دور کے آخری حصے خصوصا سولہویں سے اٹھارویں صدی میں زوال پذیر ہو کر امتِ مسلمہ تحفظات کی چادر اوڑھ کر لمبی تان کر سو گئی اور جب ہم اٹھے تو صنعتی دور کی چکا چوند سے ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ سماج کا بنیادی ڈھانچہ بدل چکا تھا۔ علم و فکر کے نئے نئے زوایے متعارف ہو چکے تھے۔ خاندان کے نظام میں جوہری تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ معیشت، معاشرت، سیاست غرض ہر شعبہِ زندگی کی صورت کیا سے کیا ہو چکی تھی۔ ہمارا سارا فقہی ذخیرہ زرعی دور میں مدون و مرتب ہوا تھا، اور اس کا ایک بڑا حصہ جدید صنعتی دور سے غیر متعلق ہو چکا تھا۔ چنانچہ کئی سو سال کے اس تغیر کو بر وقت نہ سمجھنے کی وجہ سے دانشِ عصر اور ہماری علمی روایت کے مابین کافی گہرا خلا پیدا ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مدرسہ ڈسکورسز اسی خلا کو پر کرنے کی ایک نہایت غیر معمولی کوشش ہے۔ یوں تو اس خلا کو پر کرنے کا احساس پوری دنیا میں مختلف علمی و فکری حلقوں میں موجود ہے اور اس سلسلے میں مختلف کوششیں بھی جاری ہیں، لیکن میرے خیال میں مدرسہ ڈسکورسز اپنے قبیل کی دیگر کاوشوں سے کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ چند پہلو ملاحظہ کیجئے:

پہلا یہ کہ اس بات کی ضرورت پر زور دیا گیا کہ مسلم روایت کے علمی و فکری ورثہ میں نہایت قیمتی اجزا ہیں جو نہ صرف اُس دور کے تناظر میں مفکرین و مجتہدین کی علمی سطح سے واقفیت عطا کرتے ہیں بلکہ دورِ جدید کی تحدیات کے حوالے سے بھی نہایت ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمیں یہ بھی سیکھنے کا موقع ملا کہ تراث کا صرف متن ہی اہمیت نہیں رکھتا، اس کے ارد گرد اور بین السطور بھی پوری ایک

دنیا آباد ہے۔ اس کے برعکس دیگر تجددانہ مساعیات میں اور علمی و فکری شخصیات و تحریکات میں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا جس سے ہماری نئی نسل کے اذہان میں لاشعوری طور پر روایت کے بارے میں بد اعتمادی اور نہایت غیر محسوس طریقے سے سلف سے بدگمانی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

دوسرا یہ کہ اس کورس کی وجہ سے اپنی تراث کے کئی اہم متون نظر سے گزرے جو مدارس کے نصاب میں شامل نہیں اور نہ ہی کبھی انہیں دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر سمسٹر کے بعد کسی ملک کی تہذیب و تمدن کا براہ راست مشاہدہ موقع میسر آتا ہے جس سے نئے تہذیبی، دینی، ثقافتی و سماجی مسائل اور چیلنجز کو براہ راست دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

تیسری بات اس باب میں نہایت اہم یہ ہے کہ مدرسہ ڈسکورسز میں سوال تو اُٹھائے جاتے ہیں لیکن ان کے طے شدہ جوابات نہیں دیے جاتے، جس کے بارے میں کافی عرصہ غور و خوض کرتا رہا کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ سوال تو اٹھایا جاتا ہے، لیکن اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دیا جاتا۔ بالآخر اس کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اساتذہ ہم پر اپنا کوئی فکری ڈھانچہ مسلط نہیں کرنا چاہتے، ان کی کوشش یہ ہے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ علمی و فکری آلات (Tools) سے لیس کریں تاکہ ان سوالات کا جواب ہم بذاتِ خود تلاش کر سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر علمی دیانت کا مظہر اور نہیں ہو سکتا کہ کسی سوال کا حتمی جواب دے کر مزید پہلوؤں پر سوچنے اور سمجھنے کے دروازے بند نہ کر دیے جائیں۔

آخر میں پاکستانی طلبا کے کوآرڈینیٹر حافظ محمد رشید صاحب کا تذکرہ کیسے نہ کیا جائے جنہوں نے نہ صرف اپنے فرائض منصبی پوری دلجمعی کے ساتھ ادا کیے بلکہ نہایت خوبصورت اندازِ تخاطب سے مختلف سرگرمیوں میں پاکستانی شرکاء کو پابندی وقت اور دیگر انتظامی امور کی یاد دہانی کراتے رہے اور موقع بہ موقع اپنے رس بھرے جملوں سے محظوظ بھی کرتے رہے۔

نہایت لائقِ تحسین ہیں تمام اساتذہ، تمام منتظمین جنہوں نے اس ورکشاپ کا اہتمام و انتظام کیا اور جدید علمی و فکری موضوعات پر ایک نہایت غیر معمولی اور نئے فکری آفاق سے بھرپور نشستوں کا انعقاد کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو بھرپور اجر سے نوازے اور ہمارے اساتذہ کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔